اسلامی تحریکوں کی ناکامی کے اصل اسباب

صدر الدین اصلاحی

کوئی ۳۷ برس پہلے یہ مضمون ماہنامہ زندگی کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کی اصل حیثیت کسی نظری یا علمی بحث کی نہ تھی، بلکہ ایک تذکیر و تنبیہہ کی تھی، اور اسے تحریک اسلامی کی ایک اہم ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا۔ اپنے موضوع اور مدعا کے لحاظ سے یہ آج بھی نہایت اہم ہے۔ صاحبِ مضمون کی طرف سے ضروری اصلاح و ترمیم کے بعد اس کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ (مدیر)

ایک اصولی حقیقت

دنیا میں جب بھی کوئی تحریک فاتحانہ شان سے آگے بڑھی ہے تو صرف اس لیے بڑھی ہے، کہ وہ عوامل اس کے ہم رکاب تھے جو اس جیسی تحریکوں کی زندگی اور توانائی کے ضامن ہوا کرتے ہیں۔ اور اگر اس کے قدم کہیں رک گئے ہیں یا کسی منزل پر پہنچ چکنے کے بعد وہ پھر سے بے منزل ہو گئی ہے، تو ایسا اسی وقت ہوا ہے جب ان عوامل کی ہم رکابی سے اس نے اپنے آپ کو محروم کر لیا، اور ان کی بجائے کچھ دوسری نوعیت کے عوامل کے ہاتھوں میں اپنی باگ دے دی، ایسے عوامل کے ہاتھوں میں جو اسے صرف ناتوانی، انتشار اور سکوتِ مرگ ہی دے سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو دینِ حق کی اقامت کے لیے مبعوث اور مامور کیا گیا، تو آپؐ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر یہ حقیقت اچھی طرح کھول دی گئی تھی، اور پھر وقفہ وقفہ سے انھیں اس کی مسلسل یاددہانی بھی کرائی جاتی رہی، کہ فلاں فلاں باتوں کا تمھارے اندر پایا جانا اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قطعاً ناگزیر ہے، اور فلاں فلاں چیزیں ایسی ہیں جو تمھارے اندر اگر پیدا ہو گئیں تو تمھارا نامراد ہو جانا لازمی ہے۔

پھر اس اصولی تلقین ہی پر اکتفا نہیں کر لیا گیا، بلکہ ساتھ ہی ان کے سامنے پچھلی امتوں اور دعوتوں کی تاریخِ عروج و زوال بھی کھول کر رکھ دی گئی، جو گویا واقعات کی زبان سے ان حقائق کی سچائی پر

شہادت دیتی جاتی تھی۔ خصوصاً پیش رَو اُمّت، یعنی بنی اسرائیل، کی مِلّی داستان تو اتنی تفصیل سے بیان کی گئی، اور اتنی بار بیان کی گئی، کہ وہ تمام عوامل ایک ایک کر کے ابھر کر سامنے آ گئے جنھوں نے اس ملت کو ڈبویا تھا۔ اس طرح پچھلی امتوں کی یہ سرگزشتیں، جنھیں قرآن حکیم نے اتنے اہتمام سے اپنے سینے میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے، امت مسلمہ کے لیے دراصل ایک نذیر مبین کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قرآن حکیم کی یہ تنبیہہ یقینی طور پر ایک اصولی اور دائمی تنبیہہ تھی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ امت یا اس کا کوئی گروہ جب کبھی اپنے نصب العین کی طرف چلے، تو اپنے سفر کے آغاز سے لے کر اپنی منزل مقصود پا لینے تک، اور پھر منزل پا لینے کے بعد بھی، اس تنبیہہ کو قرار واقعی عملی اہمیت دیے رہے اور ان عوامل پر برابر کڑی نظر رکھے جن کے ہاتھوں میں ملتوں اور دعوتوں کی پھانسی کے پھندے لٹک رہے ہوں۔ اب تو اس کے لیے ان عوامل کو ٹھیک ٹھیک پہچان لینا کہیں زیادہ سہل ہو گیا ہے، کیونکہ اس وقت اس کے سامنے صرف دوسری ہی ملتوں کے عروج و زوال کے واقعات اور اسباب نہیں ہیں، بلکہ خود اپنی آپ بیتی بھی موجود ہے۔

آج کے اہلِ دعوت کو ضرورت جو کچھ ہے، وہ صرف "پرہیز"، اور "احتیاط" کے زندہ عزم و احساس کی ہے۔ ورنہ "علاج" کا معاملہ ہو یا "حفظان صحت" کا، یہاں ہر ایک کے لیے مجرب تدبیروں کا پورا سامان موجود ہے۔ دعوت حق کی طویل تاریخ ہر قسم کے دعوتی تجربات اور ہر طرح کی دعوتی سرگزشتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان "آیات بینات" کے ہوتے ہوئے بھی اگر آج کسی داعی گروہ پر یہ ضرورت واضح نہ ہو سکی اور اپنی دعوت کو متوقع خطرات سے بچائے رکھنے کی فکر نے اسے مضطرب نہ رکھا، تو یہ فی الواقع اس کے عقلی دیوالیہ پن کا ثبوت ہو گا۔ اور ایسی حالت میں اسے ہرگز اس بات کا حق نہ ہو گا کہ اپنی دعوتی مہم کو کامیاب دیکھ سکے۔

خود احتسابی کی ضرورت

یہ اصولی تنبیہہ ہماری تحریک اسلامی کے لیے بھی انتہائی اہمیت کی مالک ہے۔ اس تحریک نے امت کے مختلف گروہوں کے افکار و اعمال کا گہرا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اور ان کے اندر جو بھی کوتاہیاں محسوس کی ہیں ان کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف صاف منظر عام پر رکھ دینے میں کسی رعایت سے کام نہیں لیا، کیوں کہ دعوتی اور دینی مصالح کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مگر اسے اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ تنقید اور احتساب کا فریضہ بس اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتا ہے، اور حق بات تو یہ ہے کہ یہی "بہت کچھ" ہی وہ چیز ہے جسے فی الواقع اصل تنقید اور حقیقی احتساب

سمجھنا چاہیے۔ اس سے مراد وہ تنقید ہے جو خود اپنے پر کی جائے، اور وہ احتساب ہے جس کی خوردبینوں کا رخ خود اپنے ہی افکار و اعمال کی طرف ہو۔ دوسروں کا جائزہ لینے کی واقعی ضرورت تو صرف کبھی کبھی پیش آسکتی ہے، مگر خود اپنے تنقیدی جائزے کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔

اگر اس خود احتسابی کا اہتمام نہ رکھا گیا، اور اس تحریک کے علم بردار اپنے کو اس ضرورت سے خدانخواستہ ماورا سمجھ بیٹھے، اور کسی بے پروائی یا خام خیالی کے باعث ان عوامل ہلاکت کی طرف سے بے فکر ہو رہے، تو وہ دن دور نہ ہو گا جب وہ بھی عام امت کی تاریخ دہرا رہے ہوں گے، جس کا مدت سے حال یہ ہو چکا ہے کہ کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہوئے اس کی زبان سے عیسائیوں یہودیوں اور دوسری گم راہ و معتوب قوموں پر تو برابر نفرین کرتی، اور ان کے افکار و اعمال پر لعنتیں بھیجتی رہتی ہے۔ لیکن ذرا نہیں دیکھتی کہ خود اس کا اپنا حال بھی کچھ مختلف نہیں رہ گیا ہے۔ ضرورت، اور شدید ضرورت ہے کہ آج جو لوگ وہ فرض ادا کرنے اٹھے ہوں جس کے لیے یہ امت وجود میں لائی گئی تھی، وہ اس خود رالفضیحت دیگراں رانصیحت کی شرم ناک روش سے دور رہیں۔ ورنہ ہو گا یہ کہ ایک طرف تو وہ دوسروں کی غفلتوں اور کوتاہیوں کا شکوہ کرتے ہوں گے، دوسری طرف یہی عیوب خود ان کی قوت ایمان و عمل کو گھُن کی طرح چاٹ رہے ہوں گے۔

خود احتسابی کی عمومی ذمہ داری

اس خود احتسابی کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ جماعت کا ہر فرد، خواہ اس کی پوزیشن جماعتی نظم اور ذاتی صلاحیت کے اعتبار سے کچھ ہی کیوں نہ ہو، اسے اپنے تحریکی فرائض میں فریضہ نمبر ایک نہ بنالے۔ منصب اور علم و بصیرت کی بنا پر یہ ذمہ داری صرف وسیع ہو جاتی ہے، متعلقہ اشخاص کے لیے مخصوص نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح کسی کے اندر اگر فہم و بصیرت کی صلاحیتیں معمولی ہوں، تو یہ بات اس کی ذمہ داری کو صرف محدود کر دیتی ہے ساقط نہیں کر دیتی۔ اس لیے کسی بھی فرد جماعت کا اپنے تئیں یہ گمان کر لینا کہ جماعت کو افکار و اعمال کی خرابیوں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری تمام تر اہلِ مناصب اور "بڑے" لوگوں ہی کی ہے، اور ہم جیسے "معمولی" کارکن اس کے مکلف نہیں ہیں، ایک خطرناک غلط فکری ہے۔ اور اگر یہ غلط فکری عام ہو جائے تو کچھ بعید نہیں کہ تحریک کے لیے موت و حیات کا مسئلہ پیدا ہو جائے۔

اس فکر و اہتمام اور احتیاطی کوشش کی کامیاب عملی تدبیر صرف یہ ہے کہ ان وجوہ و اسباب کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کر لی جائے جو دعوتوں کے بگاڑ اور زوال کے باعث بنتے آئے ہیں۔ پھر انکی صرف تشخیص

اور توضیح کر دینے ہی پر اکتفانہ کر لیا جائے، جس طرح کہ ایک ریسرچ اسکالر کیا کرتا ہے، بلکہ ان تنبیہوں اور عبرتوں کا ایک مرقع اور اسبابِ زوال حق کا ایک آئینہ بنا کر خود اپنے روبرو رکھ لیا جائے۔ یہ آئینہ جب جب کبھی کسی فکری یا عملی کجی کی نشان دہی کرے، تو اس کجی سے اپنے آپ کو پاک کر لینے میں نہ ایک لمحہ ضائع کیا جائے، اور نہ کسی تاویل یا مداہنت یا غفلت سے کام لیا جائے۔

لیکن یاد رہے کہ شیشے کے آئینوں میں اپنے ظاہری خط و خال کا دیکھ لینا جتنا آسان ہوتا ہے، الفاظ و معانی کے اس آئینے میں اپنے اندرون کا دیکھ لینا اتنا آسان نہیں ہوتا جب تک کہ دو باتوں کا شدت سے لحاظ نہ رکھا جائے۔

ایک تو یہ کہ نفس کی عیاریوں پر پوری نظر رکھی جائے۔ یہ شاطر نفس اپنے کو غلطیوں اور خطاؤں سے بری ظاہری کرنے میں بڑا حریص بھی واقع ہوا، اور بڑا ماہر بھی۔ اس کے پاس پُر فریب تاویلیں تیار کر لینے کی بڑی تیز رفتار مشینیں موجود ہیں۔ نقد و احتساب نے کسی غلطی کی نشان دہی کی نہیں، کہ وہ اس طرح کی تاویلوں کا ایک خوشنما پردہ اس پر ڈال دینے کے لیے لپک پڑتا ہے۔ اور کمزوریوں کا پتلا انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ نہیں، میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ فلاں بات جو مجھ سے سرزد ہوئی ہے وہ کوئی غلطی یا برائی نہیں بلکہ ان ان پہلوؤں سے عین حق و صواب تھی۔ نفس کے اس کید سے ہوشیار رہنا، کامیاب خود احتسابی کے لیے پہلی ضروری شرط ہے۔

اور یہ کوتاہیاں بسا اوقات اپنے قالب بدل بھی لیتی ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ جن کوتاہیوں نے گزشتہ تحریکوں اور جماعتوں کے اندر ایک خاص شکل اور خاص رنگ میں ظہور کیا ہو، ٹھیک اسی شکل اور اسی رنگ میں اب بھی ظہور کریں۔ شیطان کی یہ ایک بڑی مشہور اور کارگر چال ہے کہ وہ اپنی ہدایات اور ترغیبات کو ہمیشہ اور ہر شخص کے سامنے ایک ہی انداز میں پیش نہیں کرتا، بلکہ جدت سے کام لیتا اور موقع و محل کو اور انسان کی فکر و نظر کے کمزور پہلوؤں کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے، تاکہ ابن آدم آسانی سے مات کھا جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کے خلاف نفرت اور غصہ ظاہر کرتا ہوتا ہے، اسی چیز کو بسا اوقات ایک نئے جامے یا نئے قالب میں پا کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ نفس اور شیطان کے اس کید سے خبردار رہنا دوسری ضروری شرط ہے۔

اسلامی تحریکوں کی ناکامی کے اصل اسباب

ہم یہاں صرف ان خاص قسم کے اسباب و عوامل کا ہی جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جن کی خطرناکی اس بات کا تقاضا کرتی ہے، کہ ان کی طرف سے ہر حال میں اور ہر اسلامی تحریک کو چوکنا رہنا

چاہیے۔

۱۔ اخلاص اور للّٰہیت کی کمی

کسی اسلامی تحریک کے اسبابِ زوال میں سب سے نمایاں حیثیت اس مرض کو حاصل ہے جو اس کے کارکنوں کے اخلاص اور للّٰہیت کو لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ مرض جتنا ہی زیادہ شدید اور عام ہوتا ہے تحریک اتنی ہی زیادہ زندگی سے دور اور موت سے قریب ہو رہتی ہے۔ دو باتیں ایسی ہیں۔ جن کی بنا پر اس کی حیثیت دوسرے تمام اسباب سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

ایک تو یہ کہ یہ طبعاً ایک جان لیوا مرض ہے۔ اگر پوری شدت سے اس کا حملہ ہو جائے تو کسی تدبیر سے بھی اس کے مہلک اثرات کا ازالہ ممکن نہیں۔ جب کہ دوسرا کوئی بھی سببِ زوال ایسا سم قاتل نہیں ہوتا کیونکہ اس کے عمل و اثر کی رفتار کو مختلف تدبیروں سے ایک حد تک بہرحال مدھم کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ان دوسرے اسباب و عوامل میں سے بھی کچھ تو ایسے ہیں جن کا شجرۂ نسب بھی بالآخر اسی "عامل اکبر" سے جا ملتا ہے، اور جو دراصل اسی اُمّ الامراض کے انڈے بچے ہیں۔ اور باقی کا بھی حال یہ ہے کہ، اگرچہ ان کی پیدائش کچھ اور ہی ذہنی اور نفسیاتی امراض کے بطن سے ہوتی ہے، مگر یہ اخلاص و للّٰہیت کی کمی ہے جو عموماً انھیں تیزی سے پروان چڑھنے کے لیے ایک سازگار فضا بخشتی اور پھر تحریک پر کاری ضرب لگا سکنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے مقصد پر دل یکسر مطمئن، اور اس کی خاطر جدوجہد کے لیے ذہن بالکل یکسو ہو۔ دنیا کے کسی اور کام کو شریک نہ بنایا جائے۔ حتیٰ کہ اس کی بابت کچھ سوچا بھی نہ جائے۔ اپنی تمام دوڑ دھوپ اسی کے لیے خاص کر دی جائے۔ فکر پر وہی چھایا ہوا ہو اور عمل و حرکت کی باگیں تمام تر اسی کے ہاتھوں میں ہوں۔ دوسری کسی چیز سے اگر تعلق ہو تو صرف اسی حد تک جس حد تک کہ خود مقصد تحریک اس کا تقاضا کرتا ہو، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اس کی اجازت دیتا ہو۔

للّٰہیت کا مطلب یہ ہے کہ مقصد تحریک کے ساتھ یہ تعلق اور اس تعلق میں یہ اخلاص صرف اللہ کے لیے اور صرف اسی کی رضا کے لیے ہو۔ اسکی رضا کے سوا کسی اور کی رضا کا دل میں گزر ہو، نہ اس حقیقی غایت اور اس اعلیٰ مفاد کے سوا اور کوئی غایت اور مفاد نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اپنی ذات اور اپنا خاندان، اپنی قوم اور اپنی ملت، اپنی پارٹی اور اپنی جماعت، اپنا ملک اور اپنا وطن، پوری انسانیت اور ساری دنیا، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے۔ جس کی رضا یا جس کا مفاد، مقصد، تحریک سے وابستگی کا اصل محرک بن سکے۔

للّٰہیت ہی وہ خاص جوہر ہے جو کسی تحریک کو "اسلامی تحریک" بناتا ہے اور اسے دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتا ہے۔ ورنہ جہاں تک مطلق اخلاص کا تعلق ہے، وہ تو غیر اسلامی تحریکوں کے لیے بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ اسلامی تحریکوں کے لیے۔ اقامت دین کا یہ کام، جو کسی بھی صحیح اسلامی تحریک کا واحد نصب العین ہوتا ہے، اگر خالصۃ لوجہ اللہ نہ ہوگا، تو اس کا جو نام بھی چاہے رکھ دیجیے، مگر قرآنی دعوت یا اسلامی تحریک، اقامت دین یا شہادت حق کا نام اسے کسی حال میں نہ دیا جا سکے گا۔ دین کی اقامت کے لیے اخلاص اگر دھڑکتے ہوئے دل کا درجہ رکھتا ہے، تو للّٰہیت اس دل کے لیے اس کے اندر گردش کرنے والے خون صالح کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے خون سے اگر دل کا جوف خالی ہو تو یقیناً وہ زندگی کا کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔

"اللہ کی رضا" اور "آخرت کی کامیابی" کے الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ اخلاص اور للّٰہیت کے فقدان کے جو بھی نتائج ہوں گے وہ صرف اللہ کے پاس، اور آخرت ہی میں سامنے آئیں گے، اس دنیا میں ظاہر نہ ہوں گے۔ بلاشبہ افراد کی انفرادی حیثیتوں کی حد تک صورت واقعہ یہی ہے۔ مگر یہ افراد باہم مل کر جو جماعت بناتے ہیں، اسے تو ان نامبارک نتائج سے وقت کے وقت اسی دنیا میں دوچار ہو جانا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ دنیا افراد کے لیے اگرچہ صرف دار العمل ہے، مگر جماعتوں اور تحریکوں کے لیے یہ دار العمل بھی ہے اور دار الجزا بھی۔ اس لیے اگر کسی اسلامی تحریک کے افراد کے سینے اخلاص کے سوز اور للّٰہیت کے نور سے بڑی حد تک خالی ہو گئے ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ وہ ضروری زادِ راہ کے بغیر ہی سفر کر رہی ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اب کون سا بیابان اس کے لیے بیابان مرگ، بن جانے والا ہے۔

نقل ہو یا عقل، ہر ایک کا فیصلہ اسلامی تحریکوں کے انجام کے بارے میں یہی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم بار بار یہ حقیقت یاد دلاتا ہے۔ کہ اللہ کے دین کی راہ میں کی جانے والی جدوجہد کی کامیابی کا انحصار تمام تر اللہ کی نصرت پر ہے: وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِاللّٰہِ۔ اب اگر کوئی نام نہاد اسلامی تحریک بحیثیت مجموعی بھی اللہ ہی کے لیے اور اسی کی رضا کی خاطر نہ چل رہی ہو تو پھر اسے کیا حق ہے کہ وہ اس کے سہارے کی آس رکھے؟ اور کیوں اللہ تعالیٰ کا قانون عدل اسے اپنی نصرت کا سزاوار ٹھہرائے؟

عقلی اور تجرباتی نقطہ نگاہ سے دیکھیے، تو صاف نظر آئے گا کہ اخلاص و للّٰہیت سے عاری کسی "اسلامی تحریک" کو وہ اندرونی یک جہتی کبھی میسر نہیں آ سکتی جو کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے لازمی شرط ہے۔ اصل اور حقیقی مدعا نظروں سے اوجھل ہونے کے باعث اس کے مختلف کارکن، اور کارکنوں کے مختلف حلقے، اپنے الگ الگ مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کے نقشے اور طریقے تجویز کریں گے، اور ہر

گروہ اپنی ہی پسند کی ہوئی منزل کی طرف پوری تحریک اور جماعت کو کھینچ لے جانا چاہے گا۔ نتیجہ میں فکری وحدت اور عملی ہم آہنگی ناپید ہونے لگے گی، اور تحریک کا سفینہ باہمی کش مکش کے تھپیڑوں کی تاب نہ لاکر بالآخر غرق ہو رہے گا۔

دوسرے عوامل فساد کے مقابلہ میں اس روحانی مرض کا معاملہ اپنے علاج کے پہلو سے بھی بڑا ہی اہم اور نازک ہے۔ کیونکہ یہ مرض بالعموم انسان کے لاشعور یا تحت الشعور میں جنم لیتا ہے، اور پھر اسی کمین گاہ میں رہ کر اخلاص و للّٰہیت کی پونجی کو گھُن کی طرح چاٹتا رہتا ہے، اس لیے اس کا نگاہِ احتساب کی گرفت میں آجانا، بہت دشوار ہوتا ہے۔ گہرائیوں تک اتر جانے والی نظریں بھی اکثر اسے دیکھ پانے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔

پھر اگر خوش قسمتی سے کسی طرح اس مرض کی موجودگی کا احساس ہو بھی جائے، تو اس کا صحیح صحیح اعتراف کر لینا کچھ آسان نہیں رہتا۔ کیوں کہ ایک تو، اس کے لیے ایمانی حِس کی بیداری اور اخلاقی جرات کی فراوانی درکار ہوتی ہے۔ دوسرے، نوع انسانی کا ازلی دشمن اپنی مسلسل جنگ کا سب سے اہم مورچہ مومن کے قلب کو اور اس قلب کے جذبہ اخلاص و للہیت ہی کو سمجھتا ہے۔ اس لیے اس مورچہ کی جیتی ہوئی کوئی چوکی وہ آسانی سے خالی نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے آخر وقت تک گھٹنے ٹیک ٹیک کر لڑتا رہتا ہے، اور اپنا کوئی داؤ استعمال کرنے سے بچا نہیں رکھتا۔ کبھی دینداری کے پندار کو مشتعل کرتا ہے، کبھی نفس کے جھوٹے وقار کو عبرت دلاتا ہے، کبھی خوشنما تاویلوں کی افیون پلاتا ہے۔ اور اس طرح جی توڑ کر کوشش کرتا ہے کہ انسان کے اندر کا یہ انگڑائیاں لینے والا احساسِ للّٰہیت پھر غفلت کی نیند سو جائے۔ لہٰذا یہ اللہ کی عطا کی ہوئی خاص توفیق ہی ہے جو انسان کو اپنے اندر کھوٹ کا ٹھیک ٹھیک اعتراف کر لینے میں کامیاب بنا سکتی ہے۔

اس مرض کے اعتراف کے بعد تیسرا مرحلہ اس کے علاج کا آتا ہے، جو بجائے خود ایک بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے مضبوط ارادے، صحیح تدبیر، مناسب پرہیز اور ایک طویل سعی و جہد کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں بسا اوقات ایک لحہ کی غفلت منزل سے سیکڑوں کوس دور پھینک دیتی ہے۔ غرض اس راہ ہفتخوان کا ہر مرحلہ انتہائی دشوار گزار اور صبر آزما ہے۔ لیکن جسے اپنے مقصد حیات سے واقعی محبت ہو اور کسی حال میں بھی اس کی بربادی گوارا نہ ہو، اسے خوش دلی کے ساتھ ان سارے مرحلوں کو طے کرنا ہی ہوگا۔

۲۔ دینی علم و بصیرت کی خامی

دوسرا بڑا عامل، دین کے اصل سرچشموں سے راست رہنمائی حاصل کرتے رہنے کی عملی صلاحیت سے محرومی کا عامل ہے۔

اس سے بیک وقت دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک صحیح اجتہاد فکر میں اضمحلال، اور دوسرے، دینی بے بصیرتی۔ یعنی اس کے نتیجے میں ایک طرف تو تحریک کے علم برداروں پر فکری جمود اور ذہنی افلاس کا فالج گرتا ہے، دوسری طرف فکری انارکی کا فتنہ پھیلنے لگتا ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کسی تحریک میں زندگی کا نمو اور صحیح سمت پر حرکت و اقدام کی صلاحیت اسی وقت تک رہتی ہے، جب تک اسے فکری اجتہاد کی غذا ملتی رہے، اور اصل دینی سرچشموں سے اس کی راست آبیاری کا سلسلہ جاری رہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے کارفرما عناصر ان سرچشموں کا راست علم رکھتے ہوں اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضروری صلاحیت کے حامل ہوں، اور پھر اس صلاحیت سے کام لینا بھی جانتے ہوں۔ اسی کے ساتھ تحریک کے عام افراد بھی دین سے فی الجملہ واقف اور اس کے مزاج شناس ہوں، خود اپنی حدود کو بھی ٹھیک ٹھیک پہچانتے ہوں۔ لیکن اگر یہ صورت حال باقی نہ رہ سکے اور لوگ اپنے فرائض اور اپنی حدود کا لحاظ نہ رکھیں، خواص کتاب و سنت کو عملاً اپنا اصل رہنما بنائے رکھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو جائیں، یا صلاحیت رکھنے کے باوجود اس سے کام لینے کی خود اعتمادی سے محروم ہو رہیں، اور دوسری طرف عوام برخود غلط ہو جائیں، اپنی معمولی اور بالواسطہ دینی معلومات کے بل پر بطور خود دین کے تقاضے متعین کرنے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق تحریک کی راہ عمل مقرر کرنے لگیں، حتیٰ کہ انھیں دیکھ کر افتَوا بِغَیرِ عِلمٍ فَضَلُّوا وَاَضَلّوا (علم کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں) کی حالت پیدا ہو جائے، تو ظاہر ہے ایسے دن تحریک کے لیے بڑے ہی نامبارک ہوں گے۔ اس وقت اس کا حال اس کشتی کا سا ہو جائے گا جس کے ناخدا تو چپو پھینک کر الگ بیٹھ گئے ہوں، اور کشتی کے مسافر اپنے اپنے ہاتھوں کو چپو بنا کر، جدھر جی چاہتا ہو کشتی کو بہالے جانے کے شغل میں مصروف ہوں۔

۳۔ شخصیت پرستی

تیسرا عامل، جو اس دوسرے عامل سے بڑا قریبی رشتہ بھی رکھتا ہے، "شخصی عقیدتوں کا غلو" ہے، جسے عرف عام میں شخصیت پرستی کہا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے، اور تاریخی شواہد اس مطالعے کی تصدیق کرتے ہیں، کہ اس مرض کا حملہ دینی تحریکوں پر بہت ہوا کرتا ہے، اور جب ہوتا ہے تو بڑا خوفناک بھی ہوتا ہے۔

شخصیت پرستی کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے ساتھ لوگوں کا تعلق کسی بڑی شخصیت کی عقیدت کے واسطے سے ہو اور یہ عقیدت اس تعلق پر غالب ہو، خواہ اس تعلق کی ابتدا ہی اسی انداز سے ہوئی ہو یا بعد میں وہ یہ نوعیت اختیار کر گیا ہو۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی شخصیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور جس بات کو بھی صحیح مانتے ہیں اس کی سند کے بعد ہی صحیح مانتے ہیں۔ وہ اسے سخت بے ادبی سمجھتے ہیں کہ ایسے مقدس شخص کی کسی رائے، کسی فتوے اور کسی نظریے کو عقلی اور نقلی دلائل کی ترازو میں تولا جائے، اور تول لینے کے بعد ہی اسے قبول کیا جائے۔ کہنے کو تو وہ بھی کسی غیر نبی کی عصمت رائے کے قائل نہیں، مگر عملاً کسی بھی ایسے شخص کے بارے میں، جس کی عظمت ان کے دلوں پر چھائی ہوئی ہو، یہ سننا پسند نہیں کرتے کہ اس کی فلاں رائے ضعیف ہے، اس لیے لائق قبول نہیں۔

عقیدت مندی کا یہ غلو ایک طرف تو لوگوں سے قوت فیصلہ اور کھرے کھوٹے کی تمیز سلب کر لیتا ہے۔ دوسری طرف اس کے اپنے درمیان سے اٹھ جانے کے بعد انھیں حیران و ششدر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ نہیں جان پاتے کہ اب کدھر جائیں اور کیا کریں؟ اس وقت انھیں تحریک کے مستقبل کی اتنی فکر نہیں رہ جاتی جتنا کہ اس شخصیت سے محرومی کا غم لاحق ہوتا رہتا ہے۔

یہی بات حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے دوران جب ظہور میں آئی، تو اپنے آخری نتائج کے ساتھ ظہور میں آئی۔ یعنی شخصی عقیدت کے غلو کے اس فتنہ نے یہاں تک رنگ دکھایا کہ بے شمار لوگوں کو جدوجہد کے میدان سے نکال کر عزلت کے گوشوں میں بٹھا دیا۔

پس جب تک کسی تحریک کے کارکنوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی نہ ہو کہ ہمارا حقیقی قائد اور ہمارا رہنما کوئی شخص نہیں سوائے اس شخص کے جس کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے --- ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے دلوں کے اندر جب تک یہ حقیقت سرایت کیے ہوئے نہ ہو کہ رضائے الٰہی کے سوا ہماری سعی و جہد کی کوئی غایت مقصود نہیں ---- اس وقت تک اس تحریک کا حال خطرناک اور اس کا مستقبل خطرناک تر ہی رہے گا۔

۴۔ تصور دین کی بے اعتدالی

چوتھا اہم عامل "تصور دین کی بے اعتدالی" ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ احیائے دین کی کوئی تحریک جس وقت شروع ہوتی ہے، وہ ایسا وقت ہوتا ہے جب دین کی امانت دار ملت اپنے فرض منصبی سے عملاً غافل ہو چکی ہوتی ہے یا کم از کم یہ کہ وہ اس کے سلسلہ میں کوئی قابل لحاظ جدوجہد نہیں کر رہی ہوتی۔ اس کے اس رویہ کے پیچھے عموماً دو اسباب کارفرما ہوا

کرتے ہیں : ایک تو یہ کہ ملت کا احساس فرض، زندگی کی تڑپ کھو چکا ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا تصور دین بھی کسی نہ کسی حد تک ناقص اور غیر متوازن ہو چکا ہوتا ہے۔

اس حالت میں، اور ان اسباب کے پس منظر میں، جب کچھ لوگ اللہ کی توفیق پاکر میدان عمل میں نکل آتے ہیں، اور وہ دین حق کے اس پرچم کو اٹھا لیتے ہیں، جو نہ جانے کب سے کس پرسی کی حالت میں پڑا ہوتا ہے، تو فطری طور پر ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ لوگ ہر طرف سے کھینچ کر اس کے نیچے آ جائیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے بارے میں تو ان کی یہ خواہش شدید سے شدید تر ہوتی ہے۔ جو "مسلم" ہیں، اور جن کے نزدیک آج بھی اس لفظ مسلم کے معنی بدل کر، آخرت فراموش، خدا ناشناس اور خود پرست کے نہیں ہو گئے ہیں۔ اور جو ان آیتوں کو بھی، جن میں امت مسلمہ کا مقصد وجود صرف حق کی شہادت اور دین کی اقامت بتایا گیا ہے، قرآن کریم کی ویسی ہی آیات الٰہی یقین کرتے ہیں جیسا کہ نماز روزے وغیرہ کا حکم دینے والی آیتوں کو۔

اس فطری خواہش اور امید کے ساتھ وہ لوگوں کو بلانے کے لیے گلی گلی منادی کرتے پھرتے ہیں۔ ایک ایک دروازے کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے ہیں۔ جھونپڑیوں سے لے کر محلوں تک اور عبادت خانوں سے لے کر سیاست گاہوں تک ہر جگہ پکار آتے ہیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ کا جو حاصل نکلتا ہے وہ بالعموم ان کی امیدوں اور خواہشوں سے بہت کم ہوتا ہے۔ وہ بڑے دکھ اور بڑی حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ دلوں کے دروازے ان کی دعوت کے لیے کھل نہیں رہے ہیں، بلکہ الٹے پیشانیوں پر بل پڑنے لگے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ حیرت کے ساتھ سوچنے لگتے ہیں، کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز تو نہیں پیش کی جا رہی ہے جس کی حقانیت اہمیت اور ضرورت سے ایک مسلمان کو اختلاف ہو سکے، پھر یہ رد و انکار کس بنا پر ہے؟ اس سوچ بچار کے سلسلے میں جب وہ لوگوں کے اس رویہ کا ذہنی اور نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں، تو اس کے وہی دو اسباب نظر آتے ہیں، جن کا ابھی تذکرہ کیا گیا۔ یعنی احساس فرض کی مردنی اور تصور دین کی خرابی و بے اعتدالی۔ اس لیے اپنے مقصود و مدعا کی خاطر وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ان اسباب فساد کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

اب پہلی خرابی یا بیماری کے ازالے کے لیے وہ جو کچھ افہام و تفہیم کرتے ہیں، اس سے کم از کم سن ضرور لیا جاتا ہے۔ کبھی تو سرندامت جھکا کر اور اپنی تقصیروں کا اعتراف کرتے ہوئے، اور کبھی ایک سنجیدہ خاموشی کے ساتھ۔

لیکن دوسری خرابی کی اصلاح کا معاملہ اتنا پرسکون نہیں ثابت ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دینی تصورات کی کسی خامی اور بے اعتدالی کا ازالہ اس وقت تک قریب قریب ناممکن ہی ہوتا

ہے، جب تک کہ ان پر تنقید نہ کی جائے، اس لیے چار و ناچار انھیں یہ ناگوار فرض بھی انجام دینا پڑتا ہے۔ لیکن افکار و نظریات پر تنقید خواہ کتنی ہی برحق اور محتاط کیوں نہ ہو، عموماً ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کی جاتی۔ پھر تنقید بھی وہ جو عام افکار و نظریات پر نہیں، بلکہ لوگوں کے محبوب و مالوف تصورات پر کی جائے۔ یہاں تو تنقید کا فقرہ ابھی پورا بھی نہیں ہو پاتا کہ لوگ بھڑک اٹھتے ہیں، اور ہر طرف تحریک کی مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور ضد و عناد کی وہ گرم بازاری ہوتی ہے کہ اس کے مسلمہ بنیادی اصول و مقاصد تک پر حملے شروع ہو جاتے ہیں۔ کبھی سامنے سے اور کبھی پیچھے سے، کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ۔

قدرتی طور پر تحریک کے کارکن بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ان کے اندر تقریباً ضرور ہی اس کا ایک خاص ردعمل ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں ان ناقص تصورات دین کے خلاف ان کا رویہ اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ صاف دیکھتے ہیں کہ اس صورت حال کے ذمہ دار بہت کچھ یہی تصورات ہیں۔ یہ دینی ذہن رکھنے والے مسلمانوں کو بھی تحریک کے پیش کیے ہوئے نصب العین کی طرف آنے نہیں دے رہے ہیں، اس لیے اب ان کا فیصلہ بجا طور پر یہ ہوتا ہے کہ ان تصورات پر بھرپور ضرب لگائی جائے۔

لیکن دوسری طرف یہی وہ نازک وقت ہوتا ہے جب اہل تحریک خود بھی تصور دین کی ایک جوابی بے اعتدالی کے خطرے کی زد میں آجاتے ہیں۔ کیوں کہ اس وقت اس بات کا نہایت قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کے اس ردعمل میں غیر معمولی شدت اور غلو پیدا ہو جائے، اور وہ ایک غلطی کے جواب میں لاشعوری طور پر ایک دوسری غلطی کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اس موقع پر صرف وہی لوگ اس غلو سے محفوظ رہ سکتے ہیں جن کو خدا نے اونچے درجہ کی دینی بصیرت، قابل اطمینان سلیم الطبعی، اور ٹھوس فکری سنجیدگی عطا فرمائی ہو، ورنہ تحریک کی مخالفتوں کا ریلا عام لوگوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل دیتا اور اعتدال کی شاہراہ سے ہٹا کر ایک دوسرے عدم توازن کا شکار بنا دیتا ہے۔

مخالفت کرنے والے اگر کسی دینی مطالبے کو اتنا بلند مقام دینے پر مصر دکھائی دیتے ہیں جو دین میں اس کا فی الواقع ہے نہیں، تو وہ اسے اس کا واجبی مقام بھی دینے پر آمادہ نہیں رہ جاتے۔ اسی طرح اگر وہ کسی چیز کی صحیح دینی اہمیت تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہوں، تو یہ اسے اس کے واقعی مرتبے سے بھی بہت اوپر اٹھا دیتے ہیں۔

مثلاً عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ غیر معتدل ذہنیت کے لوگ، اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات میں سے کسی ایک صفت کو، اور اس کے تقاضوں کو، اس طرح ابھار دیا کرتے ہیں، کہ بعض دوسری صفات کے

تقاضے ان کے ذہنوں میں بڑی حد تک دب کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے دینی افکار و تصورات کا پورا ڈھانچہ لازماً غیر متوازن ہو رہتا ہے۔ ایسے لوگوں سے سابقہ پڑنے پر تحریک کے کارکنوں کا ردعمل یہ رخ اختیار کر سکتا ہے کہ وہ اسی صورت حال کو الٹ کر خود بھی اختیار کر لیں۔ یعنی دوسری صفات کے جو تقاضے دوسرے لوگوں کے ذہن میں دب کر رہ گئے ہوں، انھیں وہ اس شدت سے اپنے ذہنوں پر حاوی کر لیں کہ ان کے نیچے اب مذکورہ بالا پہلی صفت کے واقعی تقاضے دب کر رہ جائیں۔

یہ ایک اصولی مثال تھی۔ اس پر اسلامی تعلیمات کی ساری باتوں کو قیاس کر لیجیے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کسی جوابی بے اعتدالی کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ دین کی اصل اور مکمل حقیقت اب بھی بروئے کار نہ آسکے گی، اور اس کی حقیقی صورت زیبا پر بدستور پردہ پڑا رہ جائے گا۔ حالانکہ دینی تصور کی ہر بے اعتدالی بہرحال بے اعتدالی ہی ہے، خواہ اسے کسی تحریک کے علم بردار گروہ نے اختیار کر رکھا ہو یا کسی جمود پرست حلقے نے، اس کے مفاسد سے کسی حال میں بھی نہیں بچا جا سکتا۔ بلکہ شاید پہلی شکل میں تو یہ مفاسد اور زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ اس لیے کسی غیر متوازن دینی تصور کے ساتھ جو جدوجہد کی جائے ..... اس کو کسی اور معنی میں تو چاہے دینی جدوجہد کہہ لیجیے مگر احیائے اسلام' اور اقامت دین، کی جدوجہد قرار دینا ہرگز صحیح نہ ہو گا۔ ایسی جدوجہد کا انجام، دین کی واقعی اقامت کے نقطہ نگاہ سے بہرحال ناپسندیدہ ہی نکلے گا۔ ایک طرف تو صحیح دینی فکر و مزاج رکھنے والے لوگوں کے لیے وہ اپنے دروازے از خود بند کر لے گی۔ دوسری طرف اس کا ہر قدم جو آگے کو اٹھے گا، اصل شاہراہ سے کترا کر اٹھے گا۔ اور پھر آخر کار وہ امت کی تاریخ میں افتراق کے ایک نئے باب کا اضافہ کر کے ختم ہو جائے گی۔

۵۔ گروہی تعصب

پانچواں اہم عامل گروہی تعصب، ہے۔

انسان کی یہ ایک عام کمزوری ہے کہ وہ جس پیمانہ سے اپنے آپ کو ناپتا ہے، اسی سے دوسروں کو بھی ناپنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ساتھ حسن ظن سے کام لینے میں تو بڑا فیاض ہوتا ہے، مگر دوسروں کے معاملہ میں حد درجہ تنگ نظر بن جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تاویلیں اور رعایتیں تو سب میرے لیے ہوں، اور سخت گیریاں، سب کی سب غیروں کے لیے۔

اس جانبداری اور بے انصافی سے وہ اپنے ذاتی معاملہ کے محدود دائرے ہی میں کام نہیں لیتا بلکہ خاندانی اور قومی، نسلی، وطنی اور گروہی اور جماعتی معاملات کے وسیع دائروں میں بھی وہ اسی مذموم ذہنیت کا مظاہرہ کرتا ہے اور بسا اوقات تو یہاں اس کا ذوق ستم اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے..... اس کی

وجہ یہ ہوتی ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں اگر وہ یہ روش اختیار کرتا ہے، تب تو ہر طرف سے اس کی مذمت اور لعنت ملامت ہی ہوتی ہے، حتیٰ کہ خود اس کا اپنا ضمیر بھی، بشرطیکہ وہ بالکل ہی مرنہ گیا ہو، اندر سے جھٹکے دے دیا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ حق و صداقت کا یہ خون، قوم اور ملت کے نام پر اور پارٹی اور جماعت کی خاطر کرتا ہے، تو اس کے خلاف ایک انگلی بھی نہیں اٹھتی۔ اس کے برعکس اسے داد و تحسین کے پھولوں سے لاد دیا جاتا ہے، زندہ باد کے نعرے اس کے کانوں میں رس گھولنے لگتے ہیں، اور اسے سر آنکھوں پر بٹھالیا جاتا ہے۔ رہا اس کا ضمیر، تو تحسین و آفریں کے ان پرجوش ہنگاموں اور مظاہروں میں اسے بھی جھوٹے اطمینان یا فریب خوردگی کا شکار بن ہی جانا پڑتا ہے۔

نفس انسانی کی یہ کمزوری بڑی ہی زبردست اور ساحرانہ قوت کی مالک ہوتی ہے۔ وہ گروہ بھی جس نے پاک اور سچے جذبہ سے کسی اسلامی تحریک کا علم اٹھایا ہو، اس کے حملوں سے یکسر محفوظ نہیں خیال کیا جاسکتا۔ اسلام کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس گروہی تعصب نے امت کو بار بار جس طرح پھاڑا ہے، آپ آج بھی تاریخ کی زبان سے اس کی پوری داستان سن سکتے ہیں۔ کتنی ہی دینی تحریکیں تھیں جو، حق کی خدمت اور اقامت کے نام اور جذبہ کے ساتھ اٹھائی گئیں، مگر اسی جاہلی عصبیت کا کرشمہ تھا کہ آخر میں کہیں سے کہیں نکل گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ تحریکوں کی ابتدا میں ایمان کا محتسب ساتھ ہوتا ہے، اور قرآن کی ترازوئے عدل ہاتھ میں، مگر جب اس موذی مرض کا حملہ ہوتا ہے تو اپنا گروہ اور اپنی جماعت ہی سب کچھ بن جاتی ہے۔ اس کا مفاد، حق کا مفاد اور اس کا دفاع، حق کا دفاع قرار پاجاتا ہے۔ اس کا ہر نظریہ اور ہر رویہ اس بات کا مستحق سمجھ لیا جاتا ہے، کہ جب اس پر نظر ڈالی جائے تو انتہائی حسن ظن اور احترام سے ڈالی جائے۔ اور اس پر بھی اگر کہیں سے اس میں کوئی نقص، نگاہ کے سامنے آہی جائے تو آنکھوں پر جھٹ دونوں ہاتھ رکھ لیے جائیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ہر نظریہ اور ہر رویہ کو سوئے ظن ہی کا حقدار سمجھا جاتا ہے، اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں انتہائی بخل سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا "اپنی" جماعت، انسانوں کی جماعت نہ ہوئی، جن سے صواب کے ساتھ خطا کا بھی امکان ہے، بلکہ فرشتوں کا کوئی مقدس گروہ ہے، جن کے قریب سے بھی کسی فکری یا عملی لغزش کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ظاہر بات ہے، کہ حق پسندی اور ہدایت یافتگی کا یہ اجارہ دارانہ تصور بجائے خود ایک بڑی گمراہی ہے، یہ اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ دل، ایمانی خلوص اور للہیت کی حلاوت سے محروم ہیں۔

اس گمراہی اور کج روی کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ حمایت حق اور ثبات ایمانی کا بھیس اختیار کیے ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں بلا کی کشش بھی ہوتی ہے، انسان کو اس پر کسی

ندامت کے بجائے الٹا ایک طرح کا فخر ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفس انسانی کے لیے وہ ضلالت بڑی مرغوب بن جاتی ہے، جس پر حقانیت کی نقاب پڑی ہو۔ جو بدنصیب اس "آفت ایمان" جاہلیت، کی مضبوط گرفت میں آجاتا ہے، وہ سورج سے بھی زیادہ روشن، حق کو، اگر اس کا تعلق کہیں "باہر" سے ہو، ٹھکرا دینے میں کوئی تامل نہیں کرتا، اور علمائے یہود کی طرح دوسروں کو بھی یہ تلقین کرنے لگتا ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (صرف اسی شخص کی بات مانو جو تمھارے اپنے مذہب کا پیرو ہو)

ایسی خطرناک بیماری کا جو گروہ شکار ہو جائے، اس سے یہ توقع نری حماقت ہی ہو گی، کہ اس کی کوششوں سے دین حق کو فروغ حاصل ہو سکے گا۔ جن لوگوں کی نگاہ میں جماعتی رشتوں اور جھوٹے گروہی وقار کو یہ مقام حاصل ہو، اور جو سچائی کے اعتراف میں "اپنے" اور "غیر" کا امتیاز روا رکھتے ہوں، وہ دراصل اپنے گروہ کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ کہتے ہیں، اگر کہتے ہیں کہ ان کا مقصد اللہ کا کلمہ بلند کرنا ہے۔ کوئی شخص اپنے خدا اور اپنے گروہ دونوں کی "پوجا" ایک ساتھ نہیں کر سکتا۔

۶۔ آزادی رائے کا غلط استعمال

چھٹا اہم عامل آزادی فکر و رائے کا غلط استعمال ہے۔

یہ غلط استعمال جب ایک خاص حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو تحریک، طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور طوائف الملوکی وہ بلا ہے جس کی موجودگی میں اس بات کی کوئی امید نہیں رہ جاتی کہ تاریخ صحیح رخ پر ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گی۔ آگے بڑھ سکنے کا کیا سوال، وہ تو الٹا پیچھے کی طرف تیزی سے لڑھکنے لگے گی، جیسے چڑھائی پر جاتی ہوئی کسی ٹرین کا انجن اس سے کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔

بلاشبہ غور و فکر کی قوت ہی انسان کا امتیازی جوہر ہے۔ اس لیے اس امر میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اس قوت کا استعمال ہر شخص کا پیدائشی حق ہے، جس سے اس کو کسی حال میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے اس حق کو از خود استعمال نہیں کرتا، وہ فی الواقع اپنے آپ کو انسانیت کے مقام سے گرا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے، جو دین فطرت ہے، اپنی سوجھ بوجھ سے کام لینے کو انسان کے بنیادی حقوق ہی میں نہیں، بلکہ اس کے بنیادی فرائض میں بھی شمار کیا ہے۔ وہ اس شخص کو جو عقل و فہم سے کام نہ لے کالا نعام، (جانوروں کے مشابہ)، کہتا ہے۔ اور اس شخص کو، جو جانتے بوجھتے بھی حق بات ظاہر کرنے سے کنی کاٹ جائے، (گونگا شیطان) قرار دیتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ مقام اس نے عقل و فہم اور آزادی فکر و رائے کے صحیح، محتاط اور ذمہ

دارانہ استعمال کو دیا ہے نہ کہ غلط اور بے لگام استعمال کو۔ عقل و رائے کا غلط استعمال تو اس کے یہاں اتنا ہی مذموم ہے جتنا اس کا عدم استعمال مذموم ہے۔ چنانچہ اس نے ایسے وقت کو امت کے لیے انتہائی برا وقت بتایا ہے جب اس کے افراد سے، اپنے حدود بھول کر آزادی فکر و رائے کے غیر ذمہ دارانہ استعمال میں، چھوٹ ہو جائیں اور ہر شخص اپنی رائے کا پرستار بن جائے۔ اور اس کے نتیجے میں ہر طرف ایک ذہنی انارکی پھوٹ پڑے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہ کے انداز میں فرماتے ہیں: یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ بخل کا ہر طرف غلبہ ہے، زمام کار نفس کی خواہشوں کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کو دین پر مقدم رکھا جا رہا ہے۔ اور ہر رائے والا اپنی ہی من مانی رائے پر فریفتہ ہے۔ ساتھ ہی تمھیں یہ محسوس ہو رہا ہے، کہ تم خود بھی ان میں سے کسی برائی میں مبتلا ہو رہے ہو، تو پھر بس اپنی ہی فکر میں لگ جاؤ۔ اور دوسروں کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔

خط کشیدہ الفاظ پر ٹھیر کر غور کیجئے! ان الفاظ میں بات صرف اتنی ہی نہیں کہی گئی ہے کہ جب ہر شخص اپنی رائے پر فریفتہ ہو، بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جب ہر رائے والا اپنی رائے پر فریفتہ ہو، گویا یہ صورت حال بھی کہ، ہر رائے رکھنے والا اپنی ہی رائے پر فریفتہ ہو رہے، ایک مخلص مسلمان کو امر بالمعروف اور اصلاح امت کے معاملے میں ہمت ہار جانے پر، حق بجانب قرار دے دیتی ہے۔ پھر اس صورت حال کا تقاضا کیا کچھ نہ ہو گا جب ہر شخص خواہ وہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ہو، یا نہ ہو، ایک رائے ظاہر کر کے اسی پر فریفتہ ہو رہے، اور اسی پر اڑ جانے کا وطیرہ اختیار کر لے۔

یہ تو مرض کی وہ انتہا ہے جس کے علاج کی ہمت ایک عام انسان کسی حال میں بھی نہیں کر سکتا۔ فکر و رائے کی آزادی کا غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ استعمال کتنا خطرناک فتنہ ہے، اس حکیمانہ ارشاد نبویؐ سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

دراصل کسی بھی جماعت کے لیے یہ قطعی ضروری ہے، کہ اس کے افراد کے اندر رائے میں کسر و انکسار کی پوری صلاحیت موجود ہو۔ کوئی شخص اگر ضروری غور و فکر کے بعد ایک رائے پر پہنچ جائے، تو اسے اس بات کا تو پورا حق حاصل ہے کہ وہ مناسب موقع پر اس کو دلائل کے ساتھ پورے زور سے پیش کرے۔ مگر اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا کہ تمام لوگوں سے، اسی کو بہرحال صحیح اور برحق تسلیم کر لینے پر اصرار کرے۔ اس کے بخلاف اسے اس امکان کو لازماً سامنے رکھنا چاہیے کہ اس کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، اور دوسروں کی صحیح۔ ہو سکتا ہے، کہ اس کی نگاہ زیر بحث مسئلہ کے سارے گوشوں پر نہ پہنچ رہی ہو، یا دوسرے لوگ اپنی رائے کے حق میں جو دلیلیں دے رہے ہیں، کسی وجہ سے ان کا ٹھیک ٹھیک وزن وہ محسوس نہ کر پا رہا ہو۔

ان تمام امکانات کا لحاظ رکھنے کے باوجود بھی اگر وہ اپنی رائے کے درست ہونے پر آخر وقت تک مطمئن رہے، لیکن دوسرے شرکاء مشورہ کو اپنی اس رائے سے متاثر و متفق نہ بنا سکے، اور کثرتِ رائے سے فیصلہ اس کے خلاف ہو رہا ہو، تو اسے اب پوری فراخ دلی کے ساتھ اس فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور عمل کی حد تک اپنی رائے سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اِلّآ آنکہ یہ فیصلہ بالفرض تحریک کے اصول و مقاصد تک کو علانیہ ختم کر دینے والا ہو، اور اس کے سلسلہ میں خدانخواستہ اسلام کی منصوص ہدایات تک پسِ پشت ڈال دی گئی ہوں۔ لیکن جب تک نوعیت اجتہادی اختلافات ہی کی ہو، اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بدستور اپنی رائے پر جما رہے۔ ورنہ اس تحریک اور جماعت کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا جس کے افراد اجتماعی فیصلوں کے مقابلہ میں اپنے ذوق و رجحان ہی کو نہیں، بلکہ اپنی سوچی سمجھی رائے کو بھی قربان کر دینے کے لیے تیار نہ ہوں۔ آخر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس بشر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے اور صواب دید کو فیصلہ کن سمجھے۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپؐ نے بھی کئی بار دوسروں کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کر دی تھی۔ حالانکہ اگر آپؐ تمام کے تمام صحابہؓ کی متفقہ رائے کے خلاف بھی کوئی فیصلہ صادر فرما دیتے، تو ایک شخص بھی اس کی پیروی سے انکار نہ کرتا۔ پھر کسی زید یا بکر کو اپنی رائے پر ایسے اصرار کا استحقاق کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے کہ گویا وہ کوئی انسانی رائے نہیں ہے، بلکہ آسمانی وحی ہے جس کے ساتھ تنقید اور انکار کا رویہ اگر اپنایا گیا تو اسلام اور ایمان کا سررشتہ ہی ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

غرض آزادی فکر و رائے اور چیز ہے، اور رائے پرستی و خود پسندی دوسری چیز۔ آزادی فکر و رائے کے صحت مندانہ استعمال کی شکل میں اسلامی تحریک کی ساری توانائی اپنے مقابل محاذ پر ۔۔۔ باطل کے خلاف ۔۔۔ صرف ہوتی رہتی ہے، اور اس کے قدم مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ مگر رائے پرستی و خود پسندی کے زہر سے مسموم تحریک و جماعت کی قوتیں، پورس کے ہاتھیوں کی طرح خود اپنے ہی مورچہ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں تحریک اپنے ہی "غازیوں" کے ہاتھوں "شہید" ہو جاتی ہے۔

چنانچہ امت کی تاریخ اس حقیقت کی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، کہ خلافت راشدہ کے اختتام سے پہلے ہی امت کے درمیان اختلاف و نزاع کی جو تلوار نکل پڑی تھی، وہ آج تک نیام میں واپس نہیں جا سکی ہے، اور جو دین، وحدتِ فکر و عمل کا نقیب بن کر آیا تھا، آج اس کے ماننے والے ستر، بہتر ٹکڑیوں میں بکھرے پڑے ہیں، تو اس نادیدنی صورتِ حال کا ایک اہم سبب اختلافی امور و مسائل میں یہی رائے کا بے جا اصرار بھی ہے۔

ہوتے ہوتے یہ ذوق اتنا پختہ ہو چکا ہے، کہ اب ثانوی اہمیت کے چند مخصوص افکار و مسائل کی حفاظت ہی شہادت حق کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ رائے پرستی کے مریض اشخاص کو عموماً اپنے مریض ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس مرض ہی کو تندرستی کی سند خیال کر لیتے ہیں۔ انھیں کچھ اس طرح کا وہم ہو جاتا ہے۔ کہ اپنی فلاں رائے یا صواب دید کو چھوڑ دینا گویا استقامت علی الحق کے مقام سے گر جانا ہے۔

رائے پرستی کا یہ مرض جب اس شدت کو پہنچ جاتا ہے، تو ان کا ایک ایک سانس اختلاف و انتشار کے مہلک جراثیم اگلنے لگتا ہے، اور معاشرہ ارجافی فتنوں کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔۔۔ کہنے کو تو ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کا متحد الاقدام قافلہ، مگر حقیقت میں الگ الگ وادیوں اور بھٹکنے والے مسافروں کی الگ الگ ٹولیاں، اور ہر ٹولی، كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (اور ہر ٹولی اپنے اپنے کام پر خوش) کی مصداق یقیناً ایسی خوف ناک ذہنیت اور کج روی سے ہر اس تحریک کو ہزار بار اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے، جو اللہ کے دین کو از سرنو زندہ کرنے، اور اسے کتاب و سنت کے اوراق سے لے کر زندگی کے پھیلے ہوئے میدان میں اس کی پوری روح اور مکمل ہیئت کے ساتھ برپا کر دینا چاہتی ہو۔